OPEN ACCESS: Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219 www.arjish.com ISSN (PRINT): 2707-1200
DOI: https://doi.org/10.53575/u18.v6.01(22)195-208

عبیداللہ بیگ کے ناول "اور انسان زندہ ہے" کا فکری جائزہ

An intellectual review of Obaidullha Baig's novel "Aur Insan Zindha hai"

Dr. Saima Iqbal
Assistant Professor, Department Urdu Govt College University, Faisalabad.

Muhammad Saad
Lecturer, Department Urdu, Lahore Leads University,Lahore

Aamir Abbas Khan
M.phil Scholar, Department Urdu Govt College University, Faisalabad.

Received on: 25-01-2022 Accepted on: 27-02-2022

Abstract

Obaidullha Baig (1 October 1936-22 June 2012) was a scholar,Urdu writer ,novelist, columost, media expert and documentary filmmaker from Karachi, Sindh, Pakistan. Obaidullah Baig comes out as a novelist who wrote only two novels " Rajpoot" and " Aur Insan Zindha Hai". He introduced the new writers in a new way in plot and story of these two novels, apart from the usual approach.The hypocritical attitudes of the society have been specially highlighted by Obaidullha Baig in " Aur Insan Zindha Hai". The novelist has actually described his entire philosophy of life in this novel.The intellectual foundations of the novel are based on human compassion. In this article an intellectual review of the novel " Aur Insan Zindha Hai" will be presented.

Keywords: Obaidullha Baig, novel, Aur Insan Zindha Hai, intellectual review, Human compassion, importance of relationships, interest, fraud, social polymorphisms, instability of the world, tragedy, philosophy of life.

اُردو ادب کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ اسے ہر دور میں کچھ ایسے معتبر و اعلیٰ نام ملے جو سیاسی، سماجی اور معاشرتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ادبی سر گرمیوں کو بھی بخوبی انجام دیتے رہے۔ جس سے ادب میں گراں قدر اضافہ ہوتا رہا۔ان معتبر شخصیات میں ایک نام ایسا ہے جو کہ کسی تعارف کا محتاج نہیں اور اُسے بھلانا نہایت مشکل ہو گا۔ وہ شخصیت جنہوں نے ماحولیات کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر انہوں نے پروگرام ''کسوٹی'' سے وہ شہرت پائی جو کسی اور ادیب کے حصے میں نہ آئی۔ بے شمار اداریوں، مضامین اور ڈراموں کے خالق رہے، تراجم بھی کیے اور دو شاہکار ناول ''اور انسان زندہ ہے'' اور ''راجپوت'' بھی تحریر کیے۔ وہ ملنسار، شفیق اور علم دوست شخصیت عبیداللہ بیگ ہیں۔

1957ء سے 1958ء تک اسٹاف رائٹر ''رسالہ الشجاع'' میں کہانیاں جِم جونیر، حبیب اللہ بیگ اور عبیداللہ بیگ کے نام سے لکھتے رہے ان کا

پہلا ناول ''اور انسان زندہ ہے'' اسی رسالے میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور بعد میں اسے کتابی شکل دے دی گئی۔ 1964ء میں روزنامہ انجام سے وابستہ ہوئے اور 1967ء میں روزنامہ حریت سے منسلک ہو گئے جس میں 1967ء سے 1969ء دو سال تک اداریہ لکھنے کا کام کرتے رہے۔ اخبارات میں قصّے، کہانیاں لکھنے کا سلسلہ جاری تھا کہ وہ ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ رابعہ سید لکھتی ہیں:

''1961ء میں انہوں نے ریڈیو پاکستان میں پروگرام کا آغاز کیا جو کہ 1968ء تک جاری رہا۔ ریڈیو پاکستان میں عبید اللہ بیگ رواں تبصرے، تراجم، کہانیاں اور ڈرامے پیش کرتے تھے۔۔۔''(1)

اخبارات، رسائل اور ریڈیو سے سفر کرتے ہوئے عبید اللہ بیگ ٹیلی ویژن سے منسلک ہو گئے۔ 1973ء سے 1992ء ٹی وی کے اس انیس سالہ سفر میں وہ پی ٹی وی میں بہت سے عہدوں پر فائز رہے۔ 1981ء میں پی ٹی وی ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں ڈپٹی کنٹرولر تعینات ہوئے اور اُسی سال (1981ء) میں کنٹرولر پر ترقی پا گئے۔ 1987ء میں ''ٹی وی نامہ'' کے بانی مدیر رہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر پروگرام ''کسوٹی'' کرتے رہے۔ جس سے انہیں ایک الگ پہچان ملی اور پروگرام اپنے زمانے کا مقبول ترین پروگرام رہا۔

جب نجی ٹی وی چینلز کی ابتداء ہوئی تو عبید اللہ بیگ نے ایک نجی ٹی وی چینل پر پروگرام ''سیلانی کے ساتھ'' شروع کیا۔ یہ پروگرام اپنی نوعیت کا منفرد اور مقبولِ عام پروگرام تھا۔ جس میں بیگ صاحب ناظرین کو مختلف علاقوں کی سیر کرواتے اور ہر چیز کو جزئیات کے ساتھ پیش کرتے۔ زاہدہ حنا اپنے ایک مضمون عبید اللہ بیگ: اب انہیں ڈھونڈ میں لکھتی ہیں:

''کسوٹی کے بعد عبید اللہ بیگ ''سیلانی'' بنے۔ انہوں نے سیلانی دستر خوان تو نہیں بچھایا لیکن کیمرے کی آنکھ سے پاکستان اور بطورِ خاص سندھ کے بھولے بسرے علاقوں کے حسن کو اس طرح فلم کے فیتے پر منتقل کیا کہ وہ منظر ہماری نگاہوں میں کھُب گئے۔ یوں جیسے کوئی ہنر مند گدڑی میں چھپا ہوا لعل ڈھونڈ نکالے، یا کسی کسان کی شرماتی ہوئی بیٹی کا حسن نیم رُخ دکھائی دے۔۔۔''(2)

عبید اللہ بیگ کو بچپن ہی سے شکار کا بے حد شوق تھا۔ ان کے شکار کے پہلے استاد اُن کے کزن مظہر علی خاں عارف تھے۔ انہوں نے عبید اللہ بیگ کو شکار کے تمام حربے و فن سکھائے۔ ابتداء میں وہ چڑیا کا شکار کرتے اور چڑیوں کے پکڑنے کا پنجرہ جنگل میں لگا کر گھنٹوں انتظار کرتے رہتے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ شکار کا شوق بڑھتا گیا اور وہ ایک ماہر شکاری بن گئے۔ مظہر علی خاں عارف لکھتے ہیں:

''دونوں کو شروع ہی سے شکار کا شوق تھا۔ ابتداء ہوئی اس شوق کی تکمیل کی ''چڑی ماری'' سے۔ مجھے یاد ہے اُن کا میرے ساتھ ''پھٹک'' اُٹھائے گھومنا۔ پھٹک چڑیوں، لال وغیرہ کے پکڑنے کا ایک پنجرہ تھا جسے جنگل میں مناسب جگہ رکھ کر ہم دونوں گھنٹوں چڑیوں کے اُس میں پھنسنے کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔۔۔''(3)

پاکستان آنے کے بعد بھی اُن کا یہ شوق برقرار رہا۔ لیکن شکار کے شوق کے باوجود بھی انہوں نے جنگلی حیات اور جنگلی نباتات کے تحفظ کی کا بیڑہ اُٹھایا اور شکار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔ عالمی ماحولیاتی ادارے ''آئی یو سی این'' سے منسلک ہو کر ماحول کی بہتری کے لیے بہت کام کیا اور پھر اس میدان بہت آگے نکل گئے۔ انہوں نے ماحولیات کے موضوع پر ''فرہنگِ ماحولیات'' کے نام سے ایک لغت کی تیاری کا

کارنامہ سرانجام دیا۔

ناول سمیت جتنی بھی اصناف ہیں ان میں لکھاری کی طرف سے قارئین کے لیے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مصنّفین اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کے اچھے اور برے پہلوؤں کو قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ ادیب چونکہ معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لیے اچھے ادیب کی نظروں سے سماج میں پائے جانے والا کوئی بھی پہلو چھپتا نہیں۔ وہ معاشرے کی ناہمواریوں، مثبت اور منفی رویّوں کو قلم بند کرتے ہیں اور پڑھنے والے کے لیے بہت سے فکری زاویے کھولتے ہیں۔ عبیداللہ بیگ نے بھی اپنے ناول ''اور انسان زندہ ہے!'' میں بہت سے فکری پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

عبیداللہ کا ناول ''اور انسان زندہ ہے!'' ۵۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول رسالہ ''الشجاع'' میں ناہر سنگھ کے عنوان سے قسط وار شائع ہوتا رہا اور وہاں عبیداللہ بیگ نے حبیب اللہ بیگ کے نام سے لکھا۔ ۱۹۶۰ء میں ان کہانیوں کو ''اور انسان زندہ ہے!'' کے عنوان سے ویلکم بُک پورٹ کراچی سے شائع کروایا۔ بارِاوّل میں مصنّف کا نام حبیب اللہ بیگ ہی لکھا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں جب دوسری بار اس ناول کو شائع کروایا تو تب دُنیا حبیب اللہ بیگ کو عبیداللہ بیگ کے نام سے جانتی تھی۔ دوسری بار اس ناول کو شعبہ اشاعت ٹائمز پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی سے شائع کروایا گیا اور اب کی بار دوستوں اور ناشر کے اصرار پر حبیب اللہ بیگ کی بجائے عبیداللہ بیگ ہی لکھا گیا۔ یہ ناول آزادی سے پہلے کے سچے واقعات پر مشتمل ہے۔ جن کو مصنّف نے ناول کی صنف میں ڈھال کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار نریندر ہے۔ یہ مرکزی کردار وقت اور حالات کے مطابق چار مختلف ناموں بلکہ چار الگ الگ کرداروں کے روپ میں ڈھلتا جاتا ہے۔ نریندر سے سوم پرکاش پھر رفیق خان اور آخر میں ناہر سنگھ، ڈاکو ناہر سنگھ بنتا ہے۔

انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے۔ تمام انسانوں کے اندر جذبات واحساسات کی بدولت دوسرے انسانوں حتّٰی کہ حیوانوں کی مدد کرنے کا بھی جذبہ پایا جاتا ہے۔ یہ فطری عمل ہے جو ہر انسان کی سرشت میں قدرت کی طرف سے رکھا گیا ہے۔ یہ جذبہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے لیکن ہر انسان میں شامل ضرور ہے۔

عبیداللہ بیگ نے بھی اپنے ناول ''اور انسان زندہ ہے!'' میں اپنے مرکزی کردار اور بعض ذیلی کرداروں سے مدد و ہمدردی کے بعض کارنامے سرانجام دلوائے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مدد کرنا کسی خاص مذہب و خطہ سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی ذات پات یا رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہے بلکہ یہ خالص انسانی شے ہے۔ نریندر جو کہ ٹھاکر سورج سنگھ کا بیٹا ہے وہ کالج کے لیے نکل رہا ہوتا ہے کہ ان کے مالی کی بیٹی چمپا روتی ہوئی اس کے پاس آتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ باپو زخمی حالت میں تڑپ رہے ہیں۔ نریندر کو رام سروپ کے برے کاموں شراب نوشی اور جوا وغیرہ کھیلنے سے نفرت تھی اور چمپا کے عادات واطوار سے بھی چڑ تھی لیکن انسانی ہمدردی وانسانی فریضہ کے تحت وہ رام سروپ کو دیکھنے جاتا ہے اور کے علاج معالجے پر اپنی فیس اور جیب خرچ تک استعمال کر دیتا ہے:

''مجھے چمپا اور رام سروپ پر بے حد ترس آیا۔ اس دن مجھے کالج میں فیس جمع کرانی تھی۔ پتا جی مجھے تیس روپے ماہوار جیب خرچ دیا کرتے

تھے، وہ روپے اور فیس کے روپے میرے پاس تھے۔ لہٰذا میں نے طے کیا کہ میں رام سروپ کا علاج کراؤں گا۔ اس دن میں بجائے کالج جانے کے ایک ڈاکٹر کے پاس گیا ان سے تمام کیفیت کہی انہوں نے خود چل کر دیکھنے کو کہا لہٰذا میں ان کو لے کر کوٹھی آیا۔ انہوں نے رام سروپ کی ڈریسنگ کی نسخہ وغیرہ لکھا اور اپنی فیس اور کرایہ اور ڈریسنگ کی قیمت دوا کی قیمت اور نہ معلوم کیا کیا قیمتیں اور فیسیں لیں اور اس طرح پہلے ہی دن میرے دس بارہ روپے اُٹھ گئے۔"(4)

مدد کرنے کا یہ جذبہ تمام انسانوں کی طرح نریندر کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ رام سروپ کی تیمارداری کرتا رہا اور اس کی دوائیوں کے پیسے بھی ادا کرتا رہا۔ انسان چاہے جن حالات میں بھی ہو۔ اس کے اندر انسانیت اور مدد کا جذبہ زندہ رہتا ہے۔ نریندر جب خفیہ فروشوں کے ایجنٹ کے الزام میں گرفتار ہوتا ہے اور اسے لکھنؤ بھیجا جاتا ہے اس کی سکیورٹی پر مامور چندو رام اور رام نرائن کی حالت پر وہ ترس کھا کر اُن کی مدد کا سوچتا ہے۔ وہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ رام نرائن کے سر پر پانچ بیٹیوں کی ذمہ داری ہے اور اس کی تنخواہ صرف تیس روپے ماہوار ہے۔ میں اس کو بیٹیوں کی شادی کے لیے دو ہزار روپے دوں گا:

"نریندر سوچنے لگا کہ یہ بوڑھا شخص جسے تیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے کس طرح اپنی لڑکیوں کے فریضے سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے؟ اچانک اسے ایک اچھا خیال آیا۔۔۔! اس نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ لکھنؤ پہنچنے سے پہلے وہ رام نرائن کو دو ہزار روپیہ لڑکیوں کی شادی اور بچوں کی تعلیم پر صرف کرنے کے لیے دے گا۔۔۔ اپنے اس نیک خیال سے وہ اتنا مسرور ہوا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔"(5)

انسانی رویے، اعلیٰ اخلاق اور انسانیت سے محبت بہت سے روشن پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ انسان کے اندر دوسری قوموں کے لیے پائی جانے والی غلط فہمیوں کو ختم کرنے میں اہم کردار اخلاق اور انسان دوستی کا ہے۔ اعلیٰ اخلاق انسان کو دشمنوں میں بھی عزّت بخشتا ہے۔ ناول نگار نے مختلف انسانوں کی ہمدردی اور مدد کرنے کے جذبے کو بیان کیا ہے

انسانی زندگی میں رشتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ماں، باپ، بہن بھائی اور باقی تمام خون کے رشتے وہ عالمگیر سچ ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ خون کے رشتوں کے علاوہ احساسات کے رشتے بھی انسانی زندگی کا جزوِ خاص ہیں۔ جن میں دوست، ملازمین، افسران وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ یہ تمام رشتے انسان کے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں اور کچھ رشتوں میں لازوال محبت پنہاں ہوتی ہے۔ ناول نگار نے اپنے ناول میں کچھ رشتوں کی محبت کے نمونے قاری کے سامنے رکھے ہیں اور ان رشتوں کی محبت کو یوں لفظی جامہ پہنایا ہے کہ قاری خود کو اُن کی جگہ محسوس کرتے ہوئے واقعات کے سحر میں جکڑ جاتا ہے۔ مصنف نے وہ والے واقعات قلم بند کیے ہیں۔ جب نریندر کو اُس کے والد نے گھر سے نکالا۔ وہاں ایک بہن کی محبت، پرانے چوکیدار رام سنگھ کی دلی وابستگی اور باقی نوکروں کی نریندر سے محبت دکھائی گئی ہے۔ کسم تو نریندر کی بہن ہے۔ اس کا خون کا رشتہ ہے۔ اس کا بھائی کے لیے بے چین ہونا تو فطری عمل ہے۔ لیکن رام سنگھ اور باقی نوکروں کا نریندر سے کیا رشتہ ہے کہ وہ زار و قطار رو رہے ہیں۔ ہاں اُن کا رشتہ ہے جسے احساس کا رشتہ کہتے ہیں۔ بھائی سے بہن کی محبت گہری اور لازوال ہوتی ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے نریندر کو کسم دیدی نے اپنے زیور اتار کر زبردستی دے دیئے کہ اس کے کام آئیں گے:

"کسم بے تاب ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔۔۔ نند بھیا۔ میرے بیرن۔ اس کے آنسوؤں نے میری قمیض تر کر دی۔ میرے بدن میں آگ سی لگی تھی، میں نے کہا۔ دیدی میں جلد واپس آؤں گا اور یہ کہہ کر باہر چلا۔ دیدی نے روتے ہوئے زبردستی پتا جی کا لفافہ میرے ہاتھ میں دیا اور کانوں سے بندے نوچے، کلائی سے سونے کی چوڑیاں اتاریں اور میری شیروانی کی جیب میں رکھ کر شیروانی مجھے پہنائی۔ گھر سے نکلنا ہی تھا۔ اُف۔ وہ وقت! دیدی بار بار لپٹ کر روتی تھیں۔ سامنے کھڑے ہوئے ملازمین بھی رو رہے تھے، رام سنگھ تو سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس نے مجھے گودوں کھلایا تھا۔"(6)

یہ تو بہن کی بھائی سے محبت تھی لیکن جو باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر سے نکال رہا تھا۔ کیا وہ اپنے بیٹے سے محبت نہیں کرتا تھا؟ جس حالت میں نریندر کے والد نے نریندر اور چمپا کو دیکھا تھا وہ اسے گناہ گار ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔ یہ بات نریندر اور انکے مالی کی بیٹی چمپا تو جانتی تھی کہ نریندر بے قصور ہے۔ کسم نے بھی نریندر کو بے قصور پایا اور ہر ممکن کوشش کی کہ اسے گھر سے نہ نکالا جائے۔ مگر ٹھاکر سورج سنگھ نے نریندر کو اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ چمپا کو آغوش میں لیے کھڑا ہے۔ سورج سنگھ نے اسے اپنی خاندانی شان اور روایات کے خلاف سمجھا اور اپنی شرافت پر کلنک گردانا۔ انہوں نے نریندر کو ایک لفافہ تھما کر گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ نریندر کو آوارہ ہوتا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اسے گھر سے اس لیے نکالا کہ وہ زمانے کی ٹھوکریں کھا کر صحیح راہ متعین کر سکے۔ والد کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ وہ نریندر کو گھر سے نکال دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے اسے پانچ ہزار پانچ سو روپے اور ایک خط دیا۔ جس میں بیٹے سے محبت کا اظہار اور اس کے مستقبل کے لیے نصیحتیں درج تھیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"نریندر، کون سا ظالم اور سنگدل باپ ایسا ہو گا جو اپنے نورِ عین اور لختِ جگر کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے اپنی آنکھوں سے دور۔۔۔ گھر سے نکال دے؟ مگر کون باپ ایسا اندھا ہو گا جو اپنے اکلوتے بیٹے کو غلط راہ پر چلتا دیکھ سکے۔۔۔؟ ہمارے خاندان کی اخلاقی روایات کا یہی تقاضا ہے کہ میں تمہیں تمہاری بد کرداری کی بناء پر علیحدہ کر دوں تا کہ زمانے کی ٹھوکریں تمہاری صحیح راہ متعین کر دیں۔ تم میں جس شریف خاندان کا خون ہے وہ یقیناً تم کو آئندہ کے لیے محتاط کر دے گا۔ پانچ ہزار پانچ سو روپے کے نوٹ اس پرچے سے منسلک ہیں۔ یہ رقم اتنی ہے کہ تم ایمانداری کے ساتھ اپنا مستقبل تعمیر کر سکتے ہو۔"(7)

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ والد کی اولاد کے لیے سختی اولاد ہی کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے۔ جیسے ماں اپنی اولاد سے پیار کرتی ہے۔ ویسے ہی باپ بھی اولاد سے پیار کرتا ہے لیکن وہ اولاد کو صحیح راہ پر گامزن کرنے اور بہتر مستقبل کے لیے کچھ سختی سے کام لیتا ہے۔ "اور انسان زندہ ہے!" میں ناول نگار نے مختلف رشتوں کی اہمیت کو جس طرح بیان کیا ہے یہ ان کے وسیع المشاہدہ ہونے کی علامت ہے۔ ان رشتوں میں خون کے رشتوں کے علاوہ دوستی کے رشتے کی اہمیت وافادیت کو خاص طور پر بیان کیا ہے کہ دوست ہر وقت ہر حال میں ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہر بات میں دوست کا ساتھ دینا ہے۔

سود معاشرے کے لیے ناسور ہے۔ قرآن و حدیث میں بھی سود کی ممانعت ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے سود والوں کے لیے وہ الفاظ

استعمال کیے ہیں جو شراب پینے، زنا کرنے، چوری کرنے والوں کے لیے بھی استعمال نہیں کیے۔ سود لینے اور دینے والوں سمیت لکھنے اور گواہی دینے والے بھی اس کام میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ پاک نے ان لوگوں سے اعلان جنگ فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں واضح پیغام دیا ہے کہ جتنا سود رہتا ہے وہ چھوڑ دو اگر آپ لوگ اس کام سے باز نہیں آتے تو اللہ اور رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ قرآن مجید کے الفاظِ مبارک کچھ اس طرح سے ہیں:

''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللہِ وَ رَسُوْلِہٖ''**(8)**

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو، اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ!''

احادیث میں بھی سودی معاملات کی ممانعت ہوئی۔ حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے سود کھانے، کھلانے، لکھنے اور اس کی گواہی دینے والے پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ یہ سب اس گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ عبیداللہ بیگ اپنے ناول ''اور انسان زندہ ہے!'' میں اپنے ایک کردار صولت علی خان کے ذریعے اس سودی قرضوں کے نقصانات سے پردہ اُٹھاتے ہیں کہ کس طرح والدین کے لیے ہوئے سودی قرضے کو چکاتے چکاتے ایک نوجوان خفیہ فروش بنتا ہے۔ اس کے خفیہ فروش بن کر منشیات کے کاروبار کرنے سے کتنی ماؤں کے لعل رُل گئے۔ کتنی عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے۔ کتنی بہنوں کے بھائی اس نشے کی لعنت میں گرفتار ہو کر سڑکوں، نہروں وغیرہ کے کناروں پر پڑے ہیں۔

ناول نگار نے صولت علی خان کے ذریعے سودی قرضوں کے نقصانات کے متعلق قاری کے سامنے حقائق رکھے ہیں۔ صولت علی خان والد کی وفات کے بعد والد کے لیے ہوئے سودی قرضے چکاتے چکاتے کس طرح بری راہ پر چل پڑتا ہے کہ تمام دوستوں رشتہ داروں سے بھی قطع تعلق ہونا پڑتا ہے۔ صولت علی خان نریندر کو بتاتا ہے کہ وہ کیسے ٹھاٹھ میں رہتا تھا۔ والد کی وفات کے بعد اسے زندگی کے تلخ حقائق سے دوچار ہونا پڑا۔ خاندان کی معیشت کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ڈھائی لاکھ روپیہ سودی قرض واجب الادا تھا:

''نند! جانتے ہو کہ اس وقت مجھے کتنا صدمہ ہوا ہو گا، جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ والد صاحب میرے لیے ڈھائی لاکھ روپیہ کا سودی قرض اور ایک معزز نسل وخاندان کی پرشوکت روایات نبھانے کی ذمہ داری کا ترکہ چھوڑ کر مرے ہیں؟ دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ کا سودی قرض۔۔۔ اُف! اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرے مرحوم والد کے جاہ ووقار کے عظیم محل کی بنیادیں ریت پر رکھی گئی تھیں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اگر میرا باپ مجھے بجائے شہ سواری، قادراندازی اور فلسفہ ومنطق کے جفت سازی، آہن گری یا حکاکی جیسے فنون کی تعلیم دلواتا اور ورثے میں کھوکھلی عزت نہ چھوڑتا تو شاید آج میں اپنی زندگی ایمانداری اور اطمینان کے ساتھ گزارتا۔۔۔!''(9)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودی قرض انسان کے لیے کیسے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ کس طرح والد کی وفات کے بعد صولت نے سب مال و اسباب بیچ کر والد کا سودی قرض چکایا اور اپنے دوست سورج سنگھ کا پچاس ہزار کا مقروض ہو گیا۔ والد کا سودی قرض تو ادا کر دیا لیکن صولت سورج سنگھ کا پچاس ہزار کا مقروض ہو گیا۔ سورج سنگھ نے بہت کوشش کی کہ صولت میرے ساتھ چل اور نارنگ پور میں تجارت یا زراعت شروع کر دے۔ مگر صولت اتنا زیر بار تھا کہ سورج سنگھ کو مزید تکلیف دینا حرام سمجھتا تھا۔ اس کو ہر وقت ایک فکر لاحق ہوئی کہ کس طرح اپنے دوست کا قرض اتارا جائے۔ نوکری سے ملنے والی تنخواہ قلیل تھی اور اخراجات زیادہ۔ انہی حالات میں صولت کو والد کے دوست نے ایک راستہ دکھایا۔ جس پر چل کر صولت نے دولت تو بہت اکٹھی کر لی۔ سورج سنگھ کا قرض بھی اتار دیا لیکن وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جرم کی دنیا کا ہو کر رہ گیا:

"خیر مرتا کیا نہ کرتا۔۔۔ میرے والد کے ایک گہرے دوست تھے جن کا نام صلابت دین خاں تھا ان کے بھی اونچے ٹھاٹھ تھے۔ مگر بظاہر آمدنی کا ذریعہ چند باغات تھے۔ انہوں نے میری پریشانی کو بھانپ لیا۔ ایک دن مجھے خلوت میں زمانے کے نشیب و فراز اور حالات کی نزاکت سے آگاہ کیا اور مجھے ایک راستہ دکھایا۔۔۔ یہ راستہ بہت گندہ اور مجرمانہ تھا۔ مگر مجھے اپنی عزت بچانی تھی۔۔۔ اپنے دوست کے سامنے سرخ رو ہونا تھا۔ میں نے وہ راستہ اختیار کر لیا اور ۱۹۲۴ء میں میں نے سورج کا تمام قرض ادا کر دیا۔"(10)

سودی قرض کو اتارتے اتارتے ایک نوجوان مجرمانہ راستے پر چل پڑتا ہے۔ وہ راستہ بہت گندہ اور بھیانک ہے۔ وہ نریندر کو بتاتا ہے کہ وہ خفیہ فروش ہے۔ اسمگلر ہے۔ صولت علی خاں نریندر کو بتاتا ہے کہ اس سودی قرضے کو ادا کرتے کرتے میں جرائم کی دنیا میں پھنس چکا ہوں۔ میں نے پیسہ تو بہت اکٹھا کر لیا ہے مگر مجھے اس ذلیل دولت کی قیمت چکانا پڑی ہے۔ عزیزوں اور دوستوں سے قطع تعلق، تارک الوطنی اور ہر وقت کی خلش، بے چینی اور پریشانی کی صورت میں۔ ناول نگار نے سودی قرض کے نقصانات سے پردہ اُٹھاتے ہوئے قارئین کے لیے پیغام دیا ہے کہ کس طرح سود انسانی معاشرے کے ناسور اور زہرِ قاتل ہے۔

انسانی معاشرے میں انسان کی ملاقاتیں بہت سے لوگوں سے ہوتی ہیں۔ انسان کو معاشرے میں رہنے کے لیے بہت سے لوگوں سے میل جول اور تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔ ان میں رشتہ داروں، دوستوں، تاجروں وغیرہ سے واسطہ پڑتا ہے۔ انسان کو معاشرے میں ہر قسم کے کردار نظر آتے ہیں۔ بہت سارے مخلص لوگوں کے ساتھ ساتھ انسان کا واسطہ کبھی کبھی دھوکے باز لوگوں سے بھی پڑتا ہے۔ جو رشتوں کو بھلا کر اپنے مفادات کی خاطر دوستوں یا رشتہ داروں سے دغا بازی کرتے ہیں۔ عارضی و فانی دولت کے لیے لوگ بہت سے مخلص لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ مادیت پرستی میں لوگ اس حد تک ہوس کا شکار ہوتے ہیں کہ اپنے دوستوں کو دغا دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ ناول نگار عبید اللہ بیگ نے بھی معاشرے کے کچھ لوگوں کے چہروں سے نقاب ہٹایا ہے۔ جنہوں نے ناول کے مرکزی کردار کو دغا دیا۔ ان میں نریندر کا دوست پیارے لعل اور صولت علی خاں کے دوست ہز ہائینس شامل ہے۔ پیارے لال اور ہز ہائینس کے ذریعے اُن لوگوں کے عکاسی کی ہے۔ جو مادیت پرستی یا مفادات کی خاطر دوستوں یا رشتہ داروں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

پیارے لال وہ شخص ہے جو نریندر کا دوست اور کلاس فیلو ہوتا ہے۔ نریندر گھر سے نکالے جانے کے بعد پیارے لال کے پاس جاتا ہے۔ رہنے کے لیے نہیں بلکہ دوستوں سے مشورہ کرنے کے لیے لیکن پیارے لال اسے زبردستی اپنے پاس ٹھہرا لیتا ہے۔ دو تین دن بعد اس نے نریندر سے کہا کہ پتا جی آپ کو یہاں رکھ لینے سے سخت ناراض ہیں۔ اس نے کہا نند مجھے بہت صدمہ ہے اور میری سمجھ میں آتا کہ میں کیا کروں؟ نریندر نے کہا میں رہنے کا انتظام کر سکتا ہوں تو وہ کہنے لگے میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا لیکن نریندر نہ مانا اور نریندر نے مکان کرائے پر لے لیا۔ دوسرے دن پیارے لال بمعہ مختصر سامان وہاں آتے ہیں اور کہتے ہیں پتا جی سے لڑ آیا ہوں۔ وہ دھوکے سے نریندر کو ڈرامہ دیکھنے کے لیے تھیٹر بھیجتا ہے اور پیچھے سے نریندر کا سارا سامان لے اڑتا ہے۔ جس میں پیسے اور کسم کی طرف سے دیا گیا زیور شامل ہوتا ہے:

''ایک دن شام کو پیارے لال میرے پاس گریٹ انڈین تھیٹر کا ایک ٹکٹ لے کر آئے۔ جس میں اُن دنوں آغا حشر کا ڈرامہ ''یہودی کی لڑکی'' کھیلا جا رہا تھا اور بولے کیا پڑے پڑے سڑتے رہتے ہو۔ لو یہ میں بکنگ کر آیا ہوں آج جا کر تھیٹر دیکھو بہت عمدہ ہے۔ میں نے جتنا انکار کیا۔ اس نے اتنا ہی اصرار کیا۔ بالآخر میں راضی ہو گیا۔ رات کے آٹھ بجے کھیل شروع ہوتا تھا اور تقریباً پونے آٹھ بجے میں گھر سے نکلا۔ پیارے لال گھر ہی رہا اور اس نے یہ عذر تراشا کہ کھیل اس کا دیکھا ہوا ہے، دوسرے یہ کہ گھر کو تنہا چھوڑنا غیر مناسب ہے۔ رات کو تین ساڑھے تین بجے جب میں واپس آیا تو نہ پیارے لال تھے نہ ہی میرا بکس جس میں تمام روپیہ اور کسم دیدی کا زیور تھا۔ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی، دیوانوں کی طرح میں باہر چل کر بھاگا۔۔۔''(11)

عبیداللہ بیگ نے ناول میں مختلف لوگوں کے چہروں سے نقاب ہٹایا ہے جو رشتوں کی اہمیت کو بھلا کر اپنے ذاتی مفاد کے لیے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ سماج میں ایسے بہت سے لوگ ہیں۔ جن کے ظاہر و باطن میں تضاد ہے۔ بہت سے افراد نے شرافت کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے لیکن وہ مجرمانہ کارروائیوں میں ملوّث ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شرافت اور اعلیٰ اخلاق کی بدولت سادہ لوح انسانوں کو اپنے جال میں پھانس لیتے ہیں اور اُن کو لاعلمی میں ناجائز مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان بہروپیے لوگوں سے سماج کا کوئی بھی شعبہ محفوظ نہیں۔ ہر شعبے میں دوغلے لوگ موجود ہیں جو اپنی ظاہری شرافت سے لوگوں کے مال و عزّت کو لوٹتے رہتے ہیں اور سماج میں معزز بننے کا ڈھونگ بھی رچاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹرز، مذہبی رہنما، کاروباری حضرات، ملازمین و اعلیٰ افسران، سیاستدان حتیٰ کہ ہر شعبہ میں ایسے لوگوں کے ناپاک ہاتھ موجود ہیں۔

عبیداللہ بیگ نے بھی اپنے ناول ''اور انسان زندہ ہے!'' میں ایسے سماجی بہروپیوں کہ جن کے ظاہر و باطن میں تضاد ہے، کو بے نقاب کیا ہے۔ انہوں نے قاری کے سامنے بیان کیا ہے کہ کس طرح معصوم لوگ نام نہاد شرفاء کے چنگل میں پھنس کر انجانے میں ناجائز مقاصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مزید انہوں نے صولت علی خان، چنے میاں اور ہز ہائینس کے ذریعے یہ عیاں کیا ہے کہ کس طرح سوسائٹی میں اعلیٰ مقام رکھنے والے خفیہ طور پر جرائم کی دنیا کے سرغنہ ہوتے ہیں۔

صولت علی خاں کا بمبئی کے سوشل حلقوں میں شمار ایک پٹھان رئیس کی حیثیت سے تھا، وہ تمدنی اداروں اور تفریحی مراکز میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ شہر میں ان کی ٹیکسیوں کا پورا فلیٹ اور کئی ریسٹورنٹ چلتے تھے۔ کسی نئے کاروبار میں ان کی شراکت سرمائے کی حفاظت اور منافع

کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ سوسائٹی میں نشست و برخاست رکھتے تھے لیکن یہ راز کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ خفیہ فروش ہیں اور سماج کی رگوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ انہوں نے یہ راز نریندر پر کھولا اور بتایا کہ میں خفیہ فروش ہوں جبکہ عوام مجھے شرفاء میں شامل کرتی ہے۔

"آج اگر ہندوستان کی پولیس کو یہ معلوم ہو جائے کہ صولت علی خاں جو کہ بمبئی کا ایک شریف اور معزز باشندہ ہے، جو ایک اعلیٰ اور معزز خاندان کا فرد ہے۔ دراصل خفیہ فروشوں اور اسمگلروں کا سرغنہ اور روح رواں ہے تو مجھے پھانسی نہیں تو حبس دوام کی سزا ضرور دے دی جائے۔"(12)

صولت علی خان کے علاوہ ہز ہائینس جو کہ ریاست من تانگ کا سلطان ہے۔ وہ بھی خفیہ فروشوں کے گروہ میں شامل ہے۔ صولت نے نریندر سے یہ بات چھپائی لیکن نریندر کو تب پتا چلا جب سلطان اسے اپنے ناجائز مقصد کے لیے استعمال کر چکا تھا۔ ناول نگار یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ ان جرائم پیشہ دھندوں میں عام آدمی سے لے کر بڑی بڑی ریاستوں کے سلطان تک شامل ہیں۔ جو شرافت کا لباس پہنے معاشرے میں منشیات و دیگر غیر قانونی کاموں کو تقویت دے رہے ہیں۔

مصنف نے بعض کرداروں کی مدد سے سماجی بہروپیوں کے چہرے سے نقاب اتارا ہے جو شرافت کا لبادہ اوڑھے معصوم لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ان سماجی بہروپیوں میں پجاری، مُلّا، صوفی، تاجر اور سرکاری ملازم وغیرہ شامل ہیں۔

دنیا فانی ہے۔ ہر انسان جو اس دُنیا پر آیا ہے یا آئے گا اس نے ایک دن یہ دنیا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے جانا ہے۔ موت کا وقت متعین نہیں ہے۔ ہر لمحہ موت کے سائے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ نہیں معلوم زندگی کب اور کہاں ختم ہو جائے لیکن اس کے باوجود انسان حقیقی مقصد کو بھول کر مادیت پرستی میں لگ گیا ہے۔ دولت یوں کمائی جا رہی ہے گویا ہمیشہ کے لیے دنیا کا باسی ہو لیکن پَل کی خبر نہیں۔ یہ دنیا ناپائیدار ہے۔ موت آتے ہی انسان اس دنیا سے بے خبر قبر میں جا سوتا ہے۔ وہ دنیا سے اور دنیا اس سے بے خبر ہو جاتی ہے۔

ناول نگار نے بھی قبرستان میں اپنے مرکزی کردار کے ذریعے دنیا کی بے ثباتی کو بیان کیا ہے۔ ان کا مقصد قارئین کو زندگی کی حقیقت سے روشناس کروانا ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ خود کو دلیر و بہادر سمجھنے والے کس طرح بے بس و بے خبر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہ ہماری ہی طرح جیتے جاگتے روتے گاتے، لڑتے جھگڑتے، جشن مناتے، دکھ اُٹھاتے لوگ تھے۔ جو اب دنیا سے بے خبر سو رہے ہیں اور دنیا ان سے بے خبر اپنی رنگینیوں کے ساتھ ارتقاء کی منازل طے کر رہی ہے:

"یہاں کتنے لوگ دفن ہیں۔۔۔؟ اس نے قبروں پر نظر دوڑاتے ہوئے خود سے دل ہی دل میں سوال کیا۔

ان گنت۔۔۔ بے شمار۔۔۔ لاتعداد۔۔۔ جواب ملا۔

کون ہیں یہ لوگ۔۔۔ کون تھے یہ لوگ۔۔۔؟

میری ہی طرح، جیتے جاگتے، ہنستے بولتے، روتے گاتے، لڑتے جھگڑتے، جشن مناتے اور دکھ اُٹھاتے۔۔۔

پھر یہ سب مر گئے۔۔۔ مرتے گئے۔۔۔ یہاں آتے گئے۔۔۔ یہ بے خبر ہو گئے دنیا سے۔۔۔ یا دنیا بے خبر ہو گئی ان سے۔۔۔؟ ان کی بامصرف

وکار آمد اور بے کار وفضول زندگی کے دن ختم ہو گئے۔۔۔"(13)

دنیا فانی ہے ایک دن دنیا کے تمام جانداروں نے ختم ہو جانا ہے۔ ناول نگار نے مرکزی کردار کی مدد سے قبرستان میں دنیا کی بے ثباتی کو بیان کیا ہے کہ یہاں پر مدفون لوگ کیسے دنیاومافیہا سے بے خبر اور دنیااِن سے بے خبر ہے۔

المیہ نگاری ایک پیچیدہ عمل ہے۔المیہ کے مطالعہ کے لیے نظر غائر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ناول میں المیہ اپنا ایک الگ تاثر رکھتا ہے۔ ناول میں ایسے بہت سے کردار موجود ہوتے ہیں جو غم واندوہ کی حالت میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔ ایک ایسا کردار جس نے زندگی کے بہت سے مسائل کو قریب سے دیکھا ہوتا ہے۔ بعض واقعات المیہ زدہ کردار کی زندگی کی گھٹن اُس کردار کے اختتام پر نظر آتی ہے۔ ناول میں یہ ناول نگار کا ہنر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا کردار منتخب کرتا ہے جو ناول کے کرداروں کے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی انفرادی سطح کو برقرار رکھتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ کردار ناول کا مرکزی کردار ہو۔ یہ کردار مختلف سطحوں پر اُبھرتا اور ڈوبتا نظر آتا ہے۔ مگر جب یہ نمودار ہوتا ہے اس میں المیہ کی تمام تر پہنائیاں موجود ہوتی ہیں۔ یہ سطح ہوتی ہے جس میں المیہ کا وہ خاص کردار قاری کے تمام تر توانائی کو توڑتے ہوئے اُسے کتھارسس پہ مجبور کر دیتا ہے۔

ناول "اور انسان زندہ ہے!" میں بھی عبیداللہ بیگ ایک ایسا توانا المیاتی کردار تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو ناول میں متحرک نظر نہیں آتا لیکن وہ کردار جہاں جہاں ابھر کر آتا ہے۔ اپنے مکمل وجود اور المیاتی تاثر کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ناول کے عمیق مطالعہ کے بعد ناول کا المیاتی کردار سورج سنگھ کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ مرکزی کردار تو نہیں لیکن جب جب سامنے آتا ہے تو ایک نا ختم ہونے والا تاثر چھوڑتا ہے۔ سورج سنگھ وہ کردار ہے جس کی ساری زندگی کرب واذیت میں گزرتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو گھر سے اس لیے نکال دیتا ہے کہ وہ زمانے کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے صحیح راہ پر چلنے لگے گا۔ بیٹے کو گھر سے نکالنے کے وقت اور بعد میں بھی وہ شدید کرب میں رہتا ہے۔ ہر وقت بیٹے کی جدائی اور اس کی سلامتی کی فکر لگی رہتی ہے۔ باپ کے لیے اکلوتے بیٹے کو، جگر کے ٹکڑے کو خود سے جدا کرنا مشکل اور کٹھن لمحہ ہوتا ہے لیکن سورج سنگھ بیٹے کی اصلاح کے لیے اسے گھر سے نکال دیتا ہے۔ اس کے جذبات اور تکلیف کا اندازہ بیٹے کو دیئے ہوئے خط کو پڑھ کر بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

"مجھے پورا احساس ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔۔۔ میں تم کو اپنی آنکھوں سے دور کر رہا ہوں۔۔۔ تمہیں مطعون اور ذلیل کر کے گھر سے نکال رہا ہوں۔ اس تصوّر سے میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے، مجھے اپنی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔۔۔ مگر آزمائش کی اس بھٹی میں تمہیں ضرور جھونکنا ہے۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ خدا حافظ۔"(14)

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ ایک والد کس تکلیف سے گزر کر بیٹے کی بھلائی کے لیے اسے گھر سے نکالتا ہے۔ تاکہ وہ صحیح راہ پر گامزن ہو کر خود کو اچھا انسان ثابت کرے۔ اور واپس آکر بڑھاپے میں اس کا سہارا بنے گا۔ کئی سالوں کے فراق کے بعد اُس کو اس کا بیٹا اس حالت میں ملتا ہے کہ کفن میں لپٹا ہوا صرف سر سلامت ہے۔ جسم کو آدم خور شیر نے چیر پھاڑ دیا ہے۔ سورج سنگھ سر جھکائے چپ چاپ نا جانے کن خیالات

میں غرق ارتھی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ یقیناً وہ سوچ رہا ہو گا کہ کاش نریندر کو گھر سے نہ نکالتا۔ وہ میرے ساتھ ہوتا۔ میرے گھر میں یوں اس کا جنازہ نہ ہوتا۔ وہ خود کو اس سب حادثے کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ یہ اس کا المیہ ہے۔ سورج سنگھ کا المیہ کہ جس نے ساری زندگی کرب و اذیت میں گزار دی اور یہ امید لگائے بیٹھا رہا کہ اس کا بیٹا آئے گا۔ اس کا سہارا بنے گا لیکن ایک حادثے نے سب کچھ چکنا چور کر دیا۔ وہ اپنی قسمت پر خود کو کوس رہا ہے۔ ناول سے اقتباس ملاحظہ کریں:

"ہاتھی کے پیچھے پنڈتوں اور برہمنوں کا ہجوم ہے۔ گھنٹے اور سنکھ کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔۔۔ انہوں نے سورج سنگھ کے اکلوتے بیٹے کی ارتھی اُٹھا رکھی ہے۔۔۔ ارتھی پر سہرے لٹکے ہیں، پھولوں کے ہاروں کا ڈھیر ہے۔۔۔ ان کے پیچھے کمر جھکے سورج سنگھ ہیں۔۔۔ سینے میں آنسوؤں کا طوفان لیے۔۔۔ سر جھکائے چل رہا ہے، احمق باپ! اس نے ہی تو اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیا تھا۔۔۔"(15)

ناول نگار نے بڑی خوبصورتی سے ناول میں ٹھاکر سورج سنگھ کے المیے کو بیان کیا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو گھر سے نکال کر ساری عمر اس کی جدائی میں تڑپتا ہے اور پھر اس کی الم ناک موت پر خود کو کوستا ہے۔

ہر ادیب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اور اس کی تحریروں میں کسی نہ کسی حد تک فلسفہ حیات شامل ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ قارئین کے لیے نئی راہیں کھولتا ہے۔ یہ لکھاری کے ذوق، موضوع اور مطالعہ پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کون سا فلسفہ قاری کے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔ عبیداللہ بیگ چونکہ وسیع المطالعہ ہیں اور تجربات سے زندگی کے مختلف پہلوؤں سے خوب واقفیت رکھتے ہیں انہوں نے قاری کے سامنے "اور انسان زندہ ہے!" کی صورت میں مختلف واقعات کو جوڑتے ہوئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے معاشرتی برائیوں اور معصوم نوجوانوں کے اس میں پھنسنے پر پیدا شدہ حالات کو موضوع بنایا ہے۔

وہ یہ فلسفہ دیتے ہیں کہ کس طرح انسان ان برائیوں میں پھنستا ہے۔ مرکزی کردار نریندر فطری طور پر اچھا انسان ہے۔ اسے حالات اس نہج تک لے جاتے ہیں کہ وہ ایک خطرناک ڈاکو کی صورت میں سامنے آتا ہے اور اس کا انجام بہت خوف ناک ہوتا ہے۔ صولت علی خان جیسے نیک خصلت لوگ جو کہ اچھے اور معزز شہری بن سکتے ہیں۔ انہیں حالات خفیہ فروش بنا دیتے ہیں۔ سورج سنگھ جیسے والدین جو چھوٹی چھوٹی غلطیوں یا غلط فہمیوں سے اولاد کو گھر سے نکال دیتے ہیں اور پھر ساری زندگی ان کی جدائی کا دکھ لیے گزار دیتے ہیں۔

ناول نگار نے ان لوگوں کی عکاسی کی ہے جو فطرتاً اچھے انسان ہوتے ہیں لیکن وقت اور حالات انہیں غلط راہوں پر لگا دیتے ہیں۔ مرکزی کردار نریندر کو باپ ایک غلط فہمی کی بنا پر گھر سے نکال دیتا ہے اور وہ اس کی اصلاح کے لیے یہ اقدام اُٹھاتا ہے کہ نریندر کو زمانے کی ٹھوکریں صحیح راہ پر گامزن کر دیں گی لیکن سب کچھ اس کی منشا کے مخالف ہوتا ہے اور نریندر دن بدن برے سے برے حالات میں جکڑتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حالات اسے ڈاکو ناہر سنگھ بنا دیتے ہیں۔ صولت علی خان جیسا شریف النفس انسان والد کا سودی قرض چکاتے چکاتے خفیہ فروش بن جاتا ہے۔ مصنف ہمیں یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ انسان فطرتاً برا نہیں ہوتا اسے حالات برا بنا دیتے ہیں۔ فطرتاً انسان زندہ ہے تو اس میں انسانیت بھی زندہ ہے۔ بس وہ مشکل حالات میں مقابلہ کرتے کرتے غلط راستوں پر گامزن ہو کر جلد از جلد اپنے برے حالات سے چھٹکارا چاہتا ہے لیکن وہ

حالات سے لڑتا لڑتا برائی کے کاموں میں اتنا پھنس چکا ہوتا ہے کہ اس کے لیے اُن سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

الغرض ناول ''اور انسان زندہ ہے!'' کی فکری بنیادیں انسان اور اس کی بنیادی نفسیات پر قائم ہیں۔ انسان کی نفسیات قریباً ایک جیسی ہوتی ہیں خواہ وہ کسی بھی خطارض سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ انسان گزیدہ معاشرہ جس میں انسان دوہرے رویے اپنائے ہوئے ہیں وہیں پر نریندر جیسے انسان دوست اور غریبوں کے ہمدرد لوگ بھی رہتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ محض ظاہری باتوں کو دیکھتے ہوئے مختلف طرح کی غلط فہمیوں میں زندگیاں تباہ کر بیٹھتا ہے۔ انسانی ایسے انسانی رویوں کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ ناول کی تمام تر انسانی نفسیات غلط فہمیوں کی وجہ سے غلط فیصلوں اور اُن کے دوررس نتائج پر قائم ہیں۔

ناول ''اور انسان زندہ ہے!'' کا مرکزی کردار نریندر ہے۔ یہ کردار وقت اور حالات کے مطابق چار مختلف ناموں بلکہ چار الگ الگ کرداروں کے روپ میں ڈھلتا جاتا ہے۔ نریندر سے سوم پرکاش پھر رفیق خان اور آخر میں ڈاکو ناہر سنگھ بنتا ہے۔ ناول کا پلاٹ سادہ، منظم اور پُر اثر ہے۔ کہانی کا پلاٹ ڈاکو ناہر سنگھ کی ڈائری پر رفتہ رفتہ آگے بڑھتا ہے۔ ناول میں کہانی کا تجسس ناول میں قاری کی دلچسپی کو آگے بڑھاتی ہے۔ ناول کے ابتداء میں ہی ڈاکو ناہر سنگھ کی آدم خور شیر کے ہاتھوں موت ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اس سے ملنے والی ڈائری سے اُس کی گزشتہ زندگی کے واقعات کا علم ہوتا ہے جن کے سہارے مصنف اس کہانی کو ناول کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ڈائری سے معلوم پڑتا ہے کہ ناہر سنگھ کا اصل نام نریندر ہے۔

نریندر کے ڈاکو ناہر سنگھ بننے کی کہانی بڑی دل چسپی سے ناول نگار نے پیش کی ہے جو ایک باپ اور بیٹے کی بیک وقت ٹریجڈی کو پیش کرتا ہے۔ سورج سنگھ کا بیٹا نریندر اپنی رحم دلی کی وجہ سے ایک کردار رام سروپ کی جان بچانے کے لیے اپنی فیس کی رقم اس کے علاج پر خرچ کر دیتا ہے۔ ایک غلط فہمی کی وجہ سے سورج سنگھ اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ گھر سے نکالے جانے کے بعد نریندر کے کردار کو مختلف مراحل میں کچھ مسائل درپیش آتے ہیں۔ اُن کا سامنا کرتے کرتے ناول کا مرکزی کردار نریندر سے ناہر سنگھ ڈاکو بن جاتا ہے۔

ناول کی فکری بنیادیں انسانی ہمدردی پر مبنی ہیں۔ انسانیت اس کائنات کا سب سے بڑا مذہب ہے اور یہی اس ناول کی اساس ہے۔ انسان ایک دوسرے کی مدد بلا تفریق مذہب، رنگ و نسل کرتا نظر آتا ہے۔ کچھ مقامات پر انسانیت سوز واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں جو انسان کے اس منفی رُخ سے پردہ اُٹھاتے ہیں۔ ناول میں معاشرے کے وہ منفی پہلو جو انسانیت کے لیے زہر قاتل ہیں۔ ان کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے ''سود'' کو خاص طور پر موضوعِ بحث بنایا۔ عبید اللہ بیگ اپنے کردار صولت علی خان کے ذریعے سودی قرضوں کے نقصانات سے پردہ اُٹھاتے ہیں کہ کس طرح والدین کے لیے ہوئی سودی قرضے چکاتے چکاتے ایک نوجوان خفیہ فروش بنتا ہے۔

سماج کے منافقانہ رویوں کو عبید اللہ بیگ نے ''اور انسان زندہ ہے!'' میں خاص طور پر اجاگر کیا ہے۔ ناول نگار کا مطمح نظر اسی حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ کس طرح بہروپیے شرافت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور سماجی برائیوں کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ ناول نگار نے اس موضوع کو دنیا کی بے ثباتی سے ملا کر پیش کیا ہے۔ وہ انسان پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان کو ان رویوں سے دور رہنا چاہیے اور منافقانہ لبادہ اتار دینا چاہیے۔ ناول نگار نے

دراصل اس ناول میں اپنا پورا فلسفہ حیات بیان کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انسان کس طرح برائیوں میں پھنستا ہے اور دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک اگر انسان فطرتاً زندہ ہے تو اس میں انسانیت بھی زندہ ہے۔

مجموعی طور پر عبیداللہ بیگ ایک ایسے ناول نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں جنہوں نے محض دو ناول لکھے لیکن اپنی شناخت بطور ناول نگار ثابت کی۔ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر ان دونوں ناولوں کے پلاٹ اور کہانی میں نئے لکھنے والوں کو ایک نئی راہ سے متعارف کروایا۔ اُن کے عہد میں جہاں دیگر ناول نگار مابعد تقسیم پر گفتگو کر رہے تھے اور اپنے ناولوں میں تقسیم کے بعد کا تذکرہ کر رہے تھے وہیں عبیداللہ بیگ نے تقسیم ہند سے پہلے کی تاریخ کو موضوع بنایا۔ انہوں نے اس وقت کے ہندوستان اور اس کی تہذیب کو پیش کیا جو آزادی سے قبل تھی۔ آزادی کی طلب اور آزادی کے مضمرات کے حوالے سے جو متضاد اذہان میں خیالات اور انقلابی دور اندیشی کے سوالات کو جنم لے رہے تھے عبیداللہ بیگ نے انہیں پیش کیا اور اپنے آپ کو بطور منفرد ناول نگار کے ثابت کیا۔

حوالہ جات

1۔ رابعہ سید، عبیداللہ بیگ۔۔۔ انسانیت کا علمبردار، مشمولہ: ویب سائٹ آئی بی سی اردو، 23 جون 2020ء

2۔ زاہدہ حنا، عبیداللہ۔۔۔ اب انہیں ڈھونڈھ، مشمولہ: رابطہ ماہنامہ، جلد ۱، شمارہ ۱۰، جولائی 2012ء، ص: 26

3۔ مظہر علی خاں عارف، عبیداللہ بیگ۔۔۔ میر ابھائی، مشمولہ: رابطہ ماہنامہ، جلد ۱، شمارہ ۹، (عبیداللہ بیگ نمبر)، کراچی: جون ۲۰۱۲ء، ص: 11

4۔ عبیداللہ بیگ، اور انسان زندہ ہے، کراچی: ٹائمز پریس، ۱۹۹۳ء، ص: 22

5۔ ایضاً، ص: 70

6۔ ایضاً، ص: 73

7۔ ایضاً، ص: 74-75

8۔ البقرۃ: 278-279

9۔ عبیداللہ بیگ، اور انسان زندہ ہے، ص: 81

10۔ ایضاً، ص: 82

11۔ ایضاً، ص: 78

12۔ ایضاً، ص: 127-128

13۔ ایضاً، ص: 83

14۔ ایضاً، ص: 133

15۔ ایضاً، ص: 133-134

References

1. Rabia,Sayyad, Obaidullha Baig….Insaniat ka alambardar, mashmola, website,IBC Urdu,23 June 2020
2. Zahidha Hina,Obaidullha….ab unhain dhondh, mashmola: Raabta mahnama, vol 1, No 10,July 2012, Karachi: P.26
3. Mazhar Ali Khan Arif,Obaidullha Baib… Mera Bhai, mashmolha,Raabtha Mahnama,vol 1, No 9(Obaidullha Baig number) Karachi: June, 2012,P. 11
4. Obaidullha baig, Aur Insan Zindha Hai, Karachi: Times press,1993, P. 22
5. Ibid,P.70
6. Ibid,P.73
7. Ibid,P.75-76
8. Alquran,surat Albaqrha 278-279
9. Obaidullha Baig, Aur Insan Zindha Hai, P.81
10. Ibid,P.82
11. Ibid,P.78
12. Ibid,P.127-128
13. Ibid,P.83
14. Ibid,P.133
15. Ibid,P.133-134